قومی تعمیر میں مذہبی قیادت کا کردار

عرفان الہی کی وہ میراث جو ابراہیم و موسیٰ اور مسیح و محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام نے چھوڑی ہے، وہ علما کا سرمایہ حیات ہے۔ چنانچہ انبیا کی نیابت میں اب یہ انہی کا منصب ہے کہ اپنے ہم قوموں کو جہنم کے عذاب سے خبردار کریں اور جنت کے انعام کی خوش خبری سنائیں؛ یہ انہی کا کام ہے کہ علوم دینیہ پر غور کریں اور ان کی روشنی میں زمانے کے لیے لائحہ عمل تشکیل دیں؛ یہ انہی کا فریضہ ہے کہ دینی تعلیم کو ہر آمیزش سے پاک کریں اور اسے دنیا کے قریے قریے تک پہنچائیں؛ اور یہ انہی کی ذمہ داری ہے کہ عامہ امت کو انداز زندگی سکھائیں اور ان کی تعمیر و ترقی کے لیے صحیح راستوں کا تعین کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ علمائے امت نے ان فرائض منصبی کو نہایت خوبی سے نبھایا ہے۔ یہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے، انہوں نے جنگوں اور صحراؤں کی خاک چھانی ہے، گھر بار چھوڑے ہیں، نعمتوں سے صرف نظر کیا ہے، تازیانے کھائے ہیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور بسا اوقات اپنی جانیں بھی راہ حق میں پیش کر دی ہیں۔ بخاری و مسلم، مالک و احمد، بو حنیفہ و شافعی، غزالی و ابن تیمیہ نے دین و ملت کی جو خدمت کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اس طائفہ علمائے سرخیل تھے۔ ان کے پیروں نے عزم و استقامت اور حکمت و دانش کے ساتھ اقوام امت کی رہنمائی کی اور انہیں مدت تک جسد واحد میں پروئے رکھا۔ انہوں نے ارباب اقتدار کو ان کے فرائض سے منحرف نہیں ہونے دیا۔ عامتہ الناس کے اخلاق و کردار کو مجروح ہونے سے بچایا اور انہیں خوابوں میں جینے کے بجائے حقیقت پسندی کا درس دیا۔ اس رہنمائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اخلاق و کردار، عدل و انصاف، علم و ہنر اور نظم و ترتیب میں اوج کمال پر فائز ہوئے اور اسی بنا پر صدیوں تک عالم کی مسند اقتدار پر فائز رہے۔

امت جب زوال پزیر ہوئی تو جہاں وہ حکمران رخصت ہوئے جن کے عدل اجتماعی کو امتیں تسلیم کرتی تھیں، وہ سالار رخصت ہوئے جن کی بیعت سے ظالم قومیں کانپ جاتی تھیں، وہ صنایع رخصت ہوئے جنہوں نے ایشیہ تمدن کو ہمیز کر دیا تھا، وہ مدبر رخصت ہوئے جن کی دانش نے عمرانی علوم کے نئے درتچے کھول دیے تھے، وہ حکما رخصت ہوئے جن کے افکار نے اسرار حیات کو آشکارا کر دیا تھا، وہاں وہ داعیان دین حق، وہ معلمین کتاب و سنت اور وہ قائدین ملت اسلامیہ بھی رخصت ہو

گئے جو ان سب کے لیے قوت محرکہ کا کردار ادا کر رہے تھے اور جن کے وجود سے ان سب کا وجود قائم تھا۔ یہ علماء دنیا سے اٹھے اور اس طرح اٹھے کہ امت کا وجود روح اسلام سے خالی ہو گیا اور طاغوت کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی:

جہاں سے اس طرح اٹھے یہ اہل مے خانہ
کہ بحر و بر میں عز ازیل نے جلانے چراغ
فلک کا نوحہ زمیں کے حدود میں پہنچا
کہ کھودیا ہے ستاروں نے منزلوں کا سراغ

جو لوگ ان کے جانشین ہوئے انھوں نے علم و تحقیق اور اخلاق و تقویٰ کا بہرہ تو وا فر جمع کر لیا، مگر قومی و اجتماعی امور میں امت کی صحیح رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے امت کو جو درس دیا، واقعہ یہ ہے کہ وہ امت کی تعمیر و ترقی کے بجائے شکست و ریخت ہی کا باعث ہوا۔ اس موقع پر زمانہ ان سے یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھیں گے، حکمت و دانش کو بروئے کار لائیں گے، اسباب زوال کو متعین کر کے ان کے تدارک کی حکمت عملی ترتیب دیں گے اور پھر امت کو پوری ثابت قدمی کے ساتھ صحیح خطوط پر آگے بڑھائیں گے۔ مگر نہ زمانے کی نبض کو ٹٹولا گیا، نہ حکمت و دانش کو آزمایا گیا، نہ اسباب زوال کی تحقیق کی گئی اور نہ قومی ترقی کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا گیا۔ اس کے برعکس اس جماعت علماء کی کارگزاری کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے کچھ زوال کی نوحہ خوانی سے قوم پر مایوسی طاری کر کے خاموش ہو گئے، کچھ کنارہ کش ہو کر خانقاہوں میں کھو گئے، مگر بیشتر نے امت میں آتش جذبات کو انگیخت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہی جذبات پرور علماء اس دور زوال میں امت کی قیادت کے منصب پر فائز ہوئے اور آج تک یہ منصب انھی کے پاس ہے۔

گزشتہ دو تین صدیوں میں انھوں نے مسلمانوں کو جو رہنمائی فراہم کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

انھوں نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ انھیں معاملات دنیا کو چشم خرد سے نہیں، بلکہ نگاہ جذبات سے دیکھنا چاہیے۔ ان پر اگر زوال آیا ہے تو اس کے اسباب ان کے اپنے ہاں جو ہیں سو ہیں، مگر اس کا بڑا سبب ان کے دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ دشمن اقوام کا قلع قمع کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں اور اس وقت تک برسر پیکار رہیں، جب تک وہ ان کی سیادت تسلیم نہیں کر لیتیں یا صفحہ ہستی سے محو نہیں ہو جاتیں۔ اس جدوجہد میں اگر وہ خود دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو انھیں جان رکھنا چاہیے کہ محکومی کی زندگی سے شہادت کی موت بدرجہا بہتر ہے۔

یہ طرز عمل سکھایا ہے کہ کمزور کو طاقت ور کے جواب میں حکمت سے نہیں، بلکہ شدید رد عمل سے کام لینا چاہیے۔ حکمت سراسر بزدلی کی علامت ہے۔ اگر وہ ظلم سہتے جائیں گے تو اس کا سلسلہ دراز ہوتا جائے گا۔

یہ تعلیم دی ہے کہ انھیں اسباب و وسائل کی فکر نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اللہ کی نصرت پر بھروسہ کر کے اپنے حقوق کے لیے

برسر جنگ ہو جانا چاہیے۔ اگر ان کا ایمان سلامت ہے تو پروردگار عالم لازماً اپنے فرشتوں سے ان کی مدد فرمائیں گے۔ یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ نے کئی مرتبہ پہلے بھی مختلف میدان ہائے کارزار میں ہزاروں اور لاکھوں کے مقابلے میں سیکڑوں مسلمانوں کو فتح عظیم سے ہم کنار کیا ہے۔

یہ سمجھایا ہے کہ ان کی بقا کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ جہاں وہ مقیم ہوں، وہاں ان کے پاس لازماً سیاسی اقتدار ہونا چاہیے۔ وہ اقلیت میں ہوں تب بھی انھیں اس کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر پر امن طریقے سے یہ جدوجہد بار آور نہ ہو سکے تو پرتشدد ہو کر اسے جاری رکھنا چاہیے۔

یہ باور کرایا ہے کہ دنیا پر حکمرانی نہ صرف ان کا استحقاق ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فریضہ ہے۔ ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی استعداد کے لحاظ سے اس فرض کو بجالائے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مسلمان کا مقصد حیات ہی دنیا پر اسلام کی حکومت کا قیام ہونا چاہیے۔

یہ بتایا ہے کہ وہ خدا کے نزدیک دنیا کی سب سے مکرم قوم ہیں۔ اس لیے کہ وہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں اور ان کی زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہے۔ اس بنا پر آخرت میں تو انھیں سرخ رو ہونا ہی ہے، لیکن دنیا میں بھی وہ لائق فضیلت ہیں۔ چنانچہ اگر کسی وقت وہ اخلاقی اعتبار سے نہایت پست بھی ہو جائیں، تب بھی تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں۔

یہ واضح کیا ہے کہ ان کی سیادت کی کلید جہاد و قتال ہے۔ جب تک وہ اس میدان میں سرگرم تھے تو دنیا پر غالب تھے اور جب سے انھوں نے اس میدان کو چھوڑا ہے، محکومی ان کا مقدر بن گئی ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانا چاہتے تو انھیں جہاد و قتال کے لیے مستعد ہونا ہوگا۔

اس تعلیم و تربیت کا خلاصہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی درس ہے جو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کے علما کی زبانوں پر جاری ہے کہ مسلمانو، تلوار اٹھاؤ اور دنیا سے برسر پیکار ہو جاؤ، یہاں تک کہ دنیا کی مسند اقتدار پر قابض ہو جاؤ یا آخرت کے مرتبہ شہادت پر فائز ہو جاؤ۔

علما کی اس رہنمائی کو اگر تاریخ کے اوراق میں دیکھا جائے تو چند مثالیں بہت نمایاں ہیں۔

سید احمد شہید (۱۷۸۶-۱۸۳۱) ہیں جنھوں نے ہند میں سکھوں کی حکومت کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے تحریک شروع کی۔ جہاد کے نام پر چند سو سرفروشوں کو جمع کر کے سکھوں کی طاقت و حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ابتدا میں کچھ علاقے پر قبضہ بھی کر لیا، مگر بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر سکھوں کی بیس ہزار فوج سے مقابلے میں اپنے تمام سرفروش ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

امام شامل (۱۷۹۷-۱۸۷۱) ہیں جن کی قیادت میں داغستان کے مسلمانوں نے روسی استعمار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی۔ یہ جنگ کم و بیش پچیس سال تک جاری رہی۔ جہاد اور آزادی کے نام پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان

کیس، مگر آخر کار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مہدی سوڈانی (۱۸۴۳-۱۸۸۵) ہیں جو سوڈان کو مصر سے آزاد کرا کے انگریزوں کے خلاف برسر پیکار ہو گئے۔ اسی دوران میں ۱۸۸۵ میں ان کی وفات ہو گئی۔ ان کے جانشین زیادہ عرصہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ۱۸۹۹ میں انگریز سوڈان پر قابض ہو گئے۔ انگریز سالار نے جذبہ انتقام کے تحت سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہدی سوڈانی کی قبر اکھاڑ دی اور ان کی ہڈیاں تک جلا ڈالیں۔

مفتی اعظم امین الحسینی (۱۸۹۳-۱۹۷۴) ہیں جنہوں نے فلسطین کی آزادی کے لیے انگریزوں اور یہودیوں کے خلاف بھرپور جدوجہد کی۔ انگریزوں نے انہیں فلسطین سے جلا وطن کر دیا۔ انہوں نے آخری دم تک فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری رکھی جو بار آور نہ ہو سکی۔

حسن البنا (۱۹۰۶-۱۹۴۹) ہیں جنہوں نے مصر میں اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد کے لیے ”اخوان المسلمون“ کے نام سے تنظیم قائم کی اور رضا کار بھرتی کیے۔ اخوان کے رضا کاروں نے فلسطین کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ برطانیہ کے دباؤ پر مصری حکومت نے ”اخوان المسلمون“ پر پابندی عائد کر دی، ہزاروں کارکنوں کو قید کر لیا۔ اسی ہنگامے میں حسن البنا کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب شہید (۱۹۰۶-۱۹۶۶) ہیں جو مصر میں ”اخوان المسلمون“ ہی کے بڑے رہنماؤں میں سے تھے۔ حکومت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے ۱۵ سال قید یا مشقت کی سزا ہوئی۔ اس دوران میں صدر جمال عبدالناصر نے انہیں وزارت تعلیم کی پیش کش کی، مگر سید قطب نے انکار کر دیا۔ ۱۹۶۶ میں انہیں حکومت کے خلاف بغاوت کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔

محمد بن عبدالکریم ریفی (۱۸۸۲-۱۹۶۳) ہیں جنہوں نے شمالی مراکش پر مسلط اسپین کی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اسپین کی حکومت نے بغاوت فرو کرنے کے لیے انیس ہزار فوج بھیجی۔ عبدالکریم نے اسے زبردست شکست دے کر شمالی مراکش کو آزاد کرا لیا اور وہاں جمہوریہ ریف کے نام سے نئی حکومت قائم کی۔ اس سے فرانس کو خطرہ ہوا جو مراکش کے باقی حصے پر قابض تھا۔ اس نے اسپین سے مل کر تقریباً تین لاکھ افواج پر مشتمل لشکر تیار کیا اور بہت مختصر مدت میں ریاست ریف پر قبضہ کر کے عبدالکریم کو ۲۱ سال کے لیے قید کر دیا۔

ملا عمر ہیں جنہوں نے افغانستان کے حالیہ زمانہ طوائف الملوکی میں طالبان کے ذریعے سے بزور حکومت حاصل کی۔ امریکی سپرپاور کے مطلوبہ افراد کو پناہ دے کر پورے دینی جذبے کے ساتھ امریکہ سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ حکومت سے محروم ہوئے، ہزاروں صالح مسلمان جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور بموں کی تاخت سے افغانستان کھنڈر بن کر رہ گیا۔

یہی وہ خطوط ہیں جن پر جمال الدین افغانی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، علامہ اقبال، ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالحسن علی ندوی،

آیت اللہ خمینی، امیر شکیب ارسلان، مصطفیٰ حسن سباعی، رشید رضا مصری اور ڈاکٹر حسن ترابی رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر علمائے مسلمانوں کی تربیت کی۔ یہ سب لوگ دین کے علم بردار تھے، اسلام سے بے پناہ محبت رکھتے تھے، نیک نیت اور پاکیزہ صفت تھے اور دین و ملت کے بعض دوسرے پہلوؤں میں لافانی خدمات کے کار گزار تھے، مگر اس سب کچھ کے باوجود قومی معاملات میں غلط رہنمائی کی وجہ سے امت کے وجود اجتماعی کے لیے ضرر رسانی کا باعث ہوئے۔

یہ رجال کاراگر جذباتی ہیجان اور مثالیت پسندی سے بالاتر رہتے اور حقیقت کی زمین پر کھڑے ہو کر امت کو درپیش مسائل کا جائزہ لیتے تو ان کا طرز عمل یقیناً مختلف ہوتا۔ کاش! وہ اس موقع پر مسلمانوں کو قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس غیر متبدل قانون سے روشناس کراتے کہ:

”اللہ اس انعام کو جو کسی قوم پر کرتا ہے، اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اس چیز کو نہ بدل ڈالے جس کا تعلق خود اس سے ہے۔ بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“ (الانفال ۸: ۵۳)

”اللہ کسی قوم کے ساتھ اپنا معاملہ اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنی روش میں تبدیلی نہ کر لے۔ اور جب اللہ کسی قوم پر آفت لانے کا ارادہ کر لے تو وہ کسی کے ٹالے نہیں سکتی اور ان کا اس کے مقابلے میں کوئی بھی مددگار نہیں بن سکتا۔“ (الرعد ۱۳: ۱۱)

گویا قوموں کے عروج و زوال اور انعام و عقوبت کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اس کا انعام قوم کے کردار اور صفات پر مبنی ہوتا ہے۔ جب تک کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے مقررہ کردار کی حامل اور مطلوبہ صفات سے متصف رہتی ہے تو وہ انعامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، بصورت دیگر وہ اس کے لیے زوال اور بربادی مقدر کر دیتے ہیں۔

_____ منظور الحسن

ریفرنڈم

صدر پاکستان جناب پرویز مشرف صاحب کے بارے میں یہ تین باتیں قومی سطح پر تسلیم کی جا چکی ہیں: ایک یہ کہ ملک و قوم کے بارے میں ان کے جذبات خیر خواہانہ ہیں، دوسرے یہ کہ بہتر انتظامی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور تیسرے یہ کہ نازک حالات میں صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان حقائق کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ان کی سیاسی حیثیت تاحال محل

بحث و نظر ہے۔ انھیں خود بھی اس مسئلے کا ادراک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے سیاسی استحکام کے لیے گزشتہ ڈھائی برسوں میں کئی اقدامات کیے ہیں۔ ریفرنڈم بھی اسی نوعیت کا اقدام ہے۔ اس کے ذریعے سے انھوں نے اپنی حکومت کے لیے عوام کی تائید حاصل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلے کے حوالے سے عام لوگوں کے ذہنوں میں بہت سے سوال موجود ہیں۔ مثلاً یہ کہ کیا ریفرنڈم کا عمل شفاف ہوگا؟ اگر شفاف ہوگا تو کیا وہ عوام بھی رائے دہی کے لیے نکلیں گے جو ان کی حکومت کو ناجائز تصور کرتے ہیں؟ کیا وہ سابقہ ریفرنڈم کے تجربے کی بنا پر اسے ایک جعلی اقدام قرار دے کر گھروں میں نہیں بیٹھے رہیں گے؟ ان سوالوں کے واضح جواب زبان حال سے معلوم ہو جائیں گے۔ اس لیے یہاں ہم ان سے تعرض کیے بغیر اس اقدام کے بارے میں محض اصولی نکات بیان کرنے پر اکتفا کریں گے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کسی قومی و اجتماعی اقدام کے بارے میں اصولی رائے قائم کرتے ہوئے اسے تین پہلوؤں سے ضرور دیکھنا

چاہیے:

اول یہ کہ کیا اقدام قانونی لحاظ سے درست ہے؟

دوم یہ کہ کیا اس پر کوئی اخلاقی اعتراض تو نہیں ہوتا؟

سوم یہ کہ دین اس کے بارے میں کیا رہنمائی دیتا ہے؟

مذکورہ اقدام کو اگر قانونی لحاظ سے دیکھا جائے تو اسے درست قرار دینا محال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ آئین میں ریفرنڈم

کی پوری گنجائش موجود ہے، مگر اس کی روح یہ ہرگز نہیں ہے کہ انتخابات کی ضرورت بھی اسی طریقے سے پوری کی جائے۔ اس ضمن میں آئین کے الفاظ یہ ہیں:

”اگر صدر کسی بھی وقت، اپنی صواب دید پر یا وزیر اعظم کے مشورے پر یہ سمجھے کہ یہ مناسب ہے کہ قومی اہمیت کے کسی

معاملے کو ریفرنڈم کے حوالے کیا جائے تو صدر اس معاملے کو ایک ایسے سوال کی شکل میں جس کا جواب یا تو ”ہاں“ یا

”نہیں“ میں دیا جاسکتا ہو، ریفرنڈم کے حوالے کرنے کا حکم دے گا۔“

اس شق پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد اصلی حکومت کے انعقاد یا استحکام کے بارے میں رائے لینا نہیں

ہے، بلکہ کسی قومی اہمیت کے معاملے میں عوام کا نقطہ نظر معلوم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر افغان امریکا جنگ کے موقع پر حکومت

اس سوال پر ریفرنڈم کرا سکتی تھی کہ کیا پاکستان کو امریکا کی حمایت کرنی چاہیے؟ لیکن جہاں تک کسی فرد کی حکومت کے قیام یا

استحکام کا تعلق ہے تو اس مقصد کے لیے آئین میں انتخابات کا متعین اور واضح طریق کار موجود ہے۔

مزید برآں اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ آئین کے درج بالا الفاظ ریفرنڈم کے ذریعے سے حکومت کی تائید و

توثیق کے حصول کو نہیں روکتے، تب بھی یہ سوال بہر حال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جنرل مشرف صاحب اس اختیار کے استعمال کا حق

رکھتے ہیں؟ اس گنجائش کو کسی ایسے فرد کے لیے تو مانا جاسکتا ہے جو آئینی طریقے سے مناصب حکومت پر فائز ہوا ہو، مگر ایسے شخص

کے لیے جس نے بزور آئینی حکومت ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کیا ہو، یہ استحقاق درست معلوم نہیں ہوتا۔

اخلاقی لحاظ سے بھی اس اقدام پر بعض اعتراضات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ”طریق انتخاب“ ایک قسم کا دھوکا ہے، کیونکہ اس میں عوام کو یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی قومی مسئلے کو حل کر رہے ہیں یا اپنے سربراہ حکومت کا تقرر کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے نہ متبادل شخصیت ہوتی ہے، نہ متبادل جماعت ہوتی ہے اور نہ متبادل منشور۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ان کا جمہوری ذہن رو بہ عمل ہی نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اس موقع پر عوام کے سامنے یہ صورت رکھی ہی نہیں گئی کہ اگر ان کی اکثریت عدم اعتماد کا اظہار کرتی ہے تو کیا جنرل صاحب خود کو اقتدار سے الگ کر لیں گے؟ تیسرے یہ کہ سرکاری میڈیا کے ذریعے سے جنرل صاحب کی تائید کے لیے جو ”انتخابی مہم“ چلائی جا رہی ہے، وہ عدل و انصاف کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔

دینی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ اقدام امر ہم شوریٰ بینہم کے قرآنی اصول کے منافی ہے۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کا نظام ان کے باہمی مشورے پر مبنی ہوتا ہے۔ گویا مسلمانوں کا جب بھی کوئی اجتماعی نظام قائم ہوگا، اس میں اساسی اصول کی حیثیت اسی قاعدے کو حاصل ہوگی۔ چنانچہ اس کی رو سے ریاست کی سطح پر ہونے والا فیصلہ مسلمانوں کے مشورے ہی سے ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں ان کے فیصلے کو حتمی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ اس بنا پر جنرل صاحب کا یہ اقدام بھی ان کے سابقہ سیاسی اقدامات کی طرح درست نہیں ہے۔ انھیں اگر ریفرنڈم کرانا ہی تھا تو اس سوال پر کراتے کہ کیا عوام ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے پہلے کی سیاسی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں یا آئین کے مطابق نئے انتخابات کرانے کے خواہش مند ہیں؟ اس ملک کے عامۃ المسلمین کے باضابطہ نمائندوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے نظم سیاسی کو چلانے کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسے ہم ۱۹۷۳ء کے آئین سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ بات بے خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ پوری قوم بالاتفاق اسی طرز سیاست کی حامی ہے۔ یہ بات اگر صحیح ہے تو کسی فرد یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عوام کی رائے کے علی الرغم کوئی طرز سیاست وضع کرنے کی کوشش کرے۔ اگر عوام کے تشکیل کردہ نظام میں خامیاں موجود ہیں تو ان کی اصلاح کی ذمہ داری بھی عوام ہی کے پاس ہونی چاہیے۔ قرآن مجید کی اس صریح کنص کا یہی تقاضا ہے۔

ان نکات کی بنا پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ریفرنڈم کا اقدام قانونی، اخلاقی اور دینی لحاظ سے درست نہیں ہے۔

یہاں حرف آخر کے طور پر اس استدلال کا جائزہ بھی مناسب ہوگا جو ریفرنڈم کے حق میں عام طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ استدلال یہ ہے کہ اگر جنرل مشرف صاحب سیاسی منظر سے ہٹتے ہیں تو وہی بدعنوان سیاست دان قوم پر پھر مسلط ہو جائیں گے جنہوں نے ملک کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے سیاست دانوں کے دامن میں قوم و ملک کی خیر خواہی کا اثاثہ نہ ہونے کے برابر ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا گزشتہ پچاس سالوں میں بدعنوانی اور غیر ذمہ داری

کا مظاہرہ صرف سیاست دانوں ہی نے کیا ہے؟ کیا مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ اور فوج کے کارپردازان جرائم میں شریک نہیں رہے؟ اور کیا علما، اساتذہ، دانش ور، صحافی اور مذہبی رہنما ان سے بری الذمہ قرار دیے جاسکتے ہیں؟

اصلاح احوال کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ سیاسی نظام کو اس کی فطری رفتار کے مطابق کسی مداخلت کے بغیر چلنے کا موقع دیا جائے۔ دنیا کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی بھی نظام شکست و ریخت کے عمل سے گزرے بغیر استحکام نہیں حاصل کر سکتا۔ چنانچہ اس ملک کے لیے سب سے بڑی خیر خواہی اگر کچھ ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اس کے سیاسی عمل میں کوئی رخسہ اندازی نہ کی جائے۔ حکومتیں اگر روز بدلتی ہیں تو انھیں بدلنے دیا جائے، پارلیمنٹ اگر غلط قانون سازی کرتی ہے تو اسے کرنے دی جائے، سیاست دان اگر اپنی وفاداریاں تبدیل کرتے ہیں تو ایسا ہونے دیا جائے۔ ان کی گوشمالی اور تقرر و تنزل کا اختیار صرف اور صرف عوام کے پاس ہونا چاہیے۔ یہ عمل اگر پچیس تیس سال تسلسل کے ساتھ جاری رہتا ہے تو اسی صورت میں حقیقی اور مثبت سیاسی تبدیلی آسکتی ہے۔

_____ منظور الحسن

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com